

○ یاسر فیشان مغل

لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج، سیالکوٹ

○○ ابرار خٹک

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گویجو بیٹ کالج، نوشہرہ

○○○ طاہرہ رباب

ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

متصوفانہ لسانی روایت کے پیش رو: حضرت بابا فریدؒ اور حضرت امیر خسروؒ

Abstract:

The advent of Islamic civilization had a profound impact on the cultural system here. Not only religious movement was created but centers of training were also established where the elders did not only educate the people but the daily conversation was an automatic one. There was also a training system which gradually began to move towards other ailments of the society. Annotations and Writings Sermons and compositions triggered linguistic factors that led to literary endeavors in all languages, with their background being cultural. Baba Farid and Amir Khusroo played a vital role in the promotion and spread of Urdu. Baba Farid and Amir Khusroo completely influenced the language and literature. They penned their thoughts and teachings and their thoughts when the words of Urdu were overturned by Urdu. Baba Farid and Amir Khusroo promote the development of Urdu language and give rise to new intellectual disciplines. After having a glimpse of the services of Baba Farid and Amir Khusroo it becomes obligatory to confess that they played pivotal role in developing Urdu linguistics and preparing its Dictionary. The rules and principals of Urdu are

found in the opening sentences of Baba Farid and Amir Khusroo which also explain this, that the rules of Urdu language had begun to be formed in the time of these Baba Farid and Amir Khusroo.

Keywords:

Baba Farid, Ameer Khusro, Saints, Poets, Sufism, Poetry, Linguistics

اسلام کے پھیلاؤ کی عالم گیر تحریک کا آغاز ہوا تو برصغیر میں اسلام مذہب کی حیثیت سے پہلے جنوبی ہند کی زمین سے وارد ہوا۔ مسلمان تجارت و مبلغین نے ان مغربی ساحلوں پر اراضی حاصل کر کے مساجد تعمیر کیں۔ تجارت اور تبلیغ کا یہ عمل ایک صدی تک متحرک رہا یہاں تک کہ مالیدار میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور مالیدار کے راجا نے اسلام کو قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ یوں یہاں مسلمانوں کی آمد کا آغاز عمل تیز ہوا، نئے معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے ظاہری اور باطنی دونوں رخ پیش کرنا ضروری تھے۔ یہاں آنے والے مسلمان ضرور تھے لیکن عالم دین نہیں تھے نہ ہی مبلغ۔ اس لیے تبلیغ دین کی ذمہ داری براہ راست ان پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ محمود غزنوی کے دور میں یہاں علماء و اولیاء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ محمود غزنوی چوں کہ خود بھی صوفی منش اور صوفیا کا قدردان تھا، اس لیے اس نے یہ تحریک پیدا کی کہ علمائے دین کے ساتھ صوفیا بھی اس سرزمین پر تشریف لائیں اور مفتوحہ علاقوں میں اشاعت اسلام کا فریضہ سرانجام دیں۔ ان علماء، اولیا اور صوفیاء نے اسلام کا اتباع کرتے ہوئے عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ معاشرے سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے معاشرے میں رہ کر لوگوں کے دکھ درد کی دل جوئی بھی کی اور اسلام میں داخل بھی کیا اور جو لوگ مسلمان تھے انھیں عمل اور صالح اخلاق سے مزین بھی کیا۔ چنانچہ پہلے صوفی جن کا نام تذکروں میں ملتا ہے وہ اسماعیل بخاری ہیں جو محمود غزنوی کے عہد میں ۱۰۰۵ء میں یہاں وارد ہوئے۔ اس دور میں آنے والے زیادہ لوگ علماء تھے اس لیے ابتدائی صدیوں میں فقہ اور حدیث کی تدوین اور فلسفیانہ بحثوں میں مشغولیت کے باعث اہل علم کی بڑی تعداد عوام الناس کی اخلاقی تربیت نہ کر سکی تھی۔ صوفیاء نے اس خلا کو پر کیا۔ انہوں نے انسانی نفسیات میں گہری مہارت حاصل کی اور اس کو اپنے نظریات پھیلانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کیا۔

مسلمانوں کے علماء میں بالعموم عوام سے دوری کا رجحان رہا ہے۔ انہوں نے عام طور پر دین کو دلوں میں اتارنے کے لیے نرمی کے برعکس سختی سے کام لیا۔ اس کے برعکس مسلم صوفیاء نے عوام سے قربت اختیار کی۔ انہوں نے اپنے لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست کو عوامی بنایا۔ علماء نے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا طریقہ اختیار کیا۔ برصغیر کے علماء نے عام طور پر مقامی زبانوں کی بجائے عربی و فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس طریقے سے وہ پڑھے لکھے طبقے تک تو اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گئے مگر عوام الناس تک ان کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس صوفیاء نے عوامی طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے عوامی ذوق کے مطابق مقامی زبانوں، لہجوں اور مقامی اصناف ادب میں اپنا پیغام پیش کیا۔ یوں صوفیاء کے جانب سے دینی اور علمی عمل کا آغاز ہوا چوں کہ مقامی زبانوں میں کام کرنے وجہ سے صوفیاء نے زبان کو تحریک دی تو اس سے علمی ترقی کے عمل کا آغاز ہوا۔

اردو زبان کی تشکیل کے عمل میں صوفیاء کے حصہ بارے ڈاکٹر روبینہ ترین لکھتی ہیں کہ:

”الغرض صوفیائے کرام کی ہندوستان میں آمد سے پہلے مسلمان نہ صرف اپنی تہذیب و معاشرت اور زبان و ادب کے اثرات مقامی باشندوں پر مرتب کر رہے تھے بل کہ سیاحوں، مورخین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی ہندوستانی رسم و رواج اور زبان سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس طرح گویا نہ صرف ایک محفوظ زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی بل کہ ایک مشترک تہذیب بھی وجود میں آرہی تھی، محمود غزنوی کے حملے کے بعد صوفیائے کرام کا ورود مسعود سرزمین پاک و ہند میں ہوا تو انہوں نے نہ صرف لاکھوں افراد کو مسلمان بنایا بل کہ مسلمانوں کے تشخص کو قائم رکھنے کی سعی بھی کی۔ اردو زبان کو ترویج دینے میں ان کا جتنا حصہ ہے اور کسی کا نہیں، بقول ابواللیث صدیقی: اردو کو جوان ہونے اور پروان چڑھنے کے لیے صوفیوں کی خانقاہیں، مبلغین کی مجلسیں اور اللہ والوں کی محفلیں تلاش کرنا پڑیں۔ ان کے بھی دربار تھے۔ مگر شاہی دربار نہ تھے۔ یہ عوام کے لیے کھلتے تھے، یہاں شرافت کی زبان، ثقافت کی زبان اور تہذیب کی زبان کا سکھ نہیں چلتا تھا۔ یہاں عوام کے دلوں میں اترنے کے لیے عوام کی بولی کا رواج تھا۔ چنانچہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں سب سے زیادہ صوفیائے کرام ہی نے کام کیا۔“ (۱)

صوفیائے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اُس زبان اور لہجے کو اپنایا جو عام لوگوں کے فہم و ادراک سے انتہائی مماثلت اور قربت رکھتا ہو، کیوں کہ لوگوں کو ہم خیال بنانے کے لیے انہی کی زبان اثر پذیر ہوتی ہے چوں کہ اُن خیالات کو اپنانے اور اس زبان کو سیکھنے کے لیے انہیں دماغی خفت نہیں اٹھانی پڑتی۔ چنانچہ وعظ و تلقین اور رشد و ہدایت کے لیے صوفیائے عوام سے انہی کی بولی میں بات چیت کی۔ جس سے مشترکہ عوامی زبان کے فروغ کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس عہد کے صوفیاء کی تخلیق کردہ نظم و نثر کے جو نمونے سامنے آئے ہیں ان پر مقامی اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اگرچہ یہ صوفیاء اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہیں تھے۔ ان کا مقصد زبان کی ترقی نہیں تھا۔ لیکن جب صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کے لیے جب اس مقامی زبانی کو اپنا وسیلہ بنایا یہ کام دونوں صورتوں میں ہوا یعنی تحریر اور تقریر اور یوں تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ زبان کو اسطو سے اردو زبان کی خدمت بھی کر گئے۔ ان کا یہ عمل مذہب کے ساتھ ساتھ زبان کی ترقی کا سبب بھی بنتا گیا۔ گویا زبان خود بخود فروغ اور ترقی کے عمل سے گزری اور اس میں نئی اصطلاحات شامل ہوئیں۔ چنانچہ قدیم اردو کے جو نمونے سامنے آئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان پندرہویں سے سترہویں صدی عیسوی تک پورے ملک میں رائج تھی اور اس کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے بہت حصہ لیا تھا۔ بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق:

”ہندی یا اس نومولود زبان میں لکھنا اہل علم اپنے لیے باعث عار سمجھتے تھے اور اپنی عالمانہ تصانیف کو اس حقیر اور بازاری زبان کے استعمال سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ صوفی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے جرأت کی اور اس قفل کو توڑا..... ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی جو پہلے ہچکچاتے تھے اس زبان کا استعمال شعر و سخن، زبان و تعلیم اور علم و حکمت کی اغراض کے لیے

شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔“ (۲)

ان صوفیاء کی خدمات کے اعتراف میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مقامی مزاج و طبیعت کو سمجھنے اور اس کے ادراک میں بلا شبہ صوفیاء کا طبقہ سب سے کامیاب ہوا، ان میں بھی چشتی بزرگوں کو اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے انسانیت کی تفہیم کو اصل سرمایہ حیات قرار دیا اور تخت و تاج کی بجائے عوام و خواص کے دلوں پر اپنی حکومت قائم کی۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں بعد بھی یہ بزرگان بالخصوص بزرگان چشت آج بھی عوام الناس کے دلوں میں ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت خواجہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادیؒ، حضرت مولانا فخر الدینؒ چراغ چشت یک ساں طور پر مقبول و موثر ہوئے ہیں۔ آج بھی ان کی بارگاہوں میں مذاہب کی تفریق لایعنی محسوس ہوتی ہے۔

اردو زبان و ادب میں صوفیانہ شاعری کے آغاز کا کوئی حتمی نقطہ متعین کرنا تو ممکن نہیں ہے البتہ جدید تحقیق کی رہنمائی میں قریب قریب دور کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ آغاز حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے زمانے (۵۶۹ھ تا ۶۱۴ھ/۱۲۷۳ء تا ۱۲۶۵ء) سے متعین کیا جاسکتا ہے اور یہ دور اردو غزل کے آغاز سے کچھ بعد کا دور ہے۔ (۳) آپ کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا جس کا آغاز برصغیر پاک و ہند میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے وجود مسعود کے طفیل ہوا۔ ان کے جانشین حضرت بختیار کاکیؒ ہوئے۔ پھر یہ خرقہ خلافت حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے ہوتا ہوا حضرت نظام الدین اولیاءؒ تک منتقل ہوا جن کے مرید خاص اردو، فارسی کے عظیم صوفی شاعر حضرت امیر خسروؒ تھے۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے چند اقوال، کچھ مفرد آیات اور دو ایک ریتختے منسوب ہیں۔ آپ کا ایک ریتختہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے سخاوت مرزا کی ایک نایاب بیاض کے حوالے سے رسالہ اردو میں درج کیا ہے۔ اس ریتختے میں شطرنج کے کھیل کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے تصوف کے مسائل پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

بند گھری میں کئی کرامات دکھائی بازی مری مات ہے کس آنکھوں مائی
بازی جاوے فرید کی کس آنکھوں سا کے صدقے نبی رسول کے جس قائم راکھے (۴)

مولوی عبدالحق ہی نے اپنی کتاب اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام میں بابا فریدؒ کا یہ ریتختہ بھی درج کیا ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا نحسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا چہ روی زیر خاک نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بہ دل و جان شنو ضائع مسکن عمر عزیزات ہے (۵)

علمائے ادب کا ماننا ہے اردو شاعری بالخصوص غزل کا آغاز انہی ریتختوں سے ہوا جن میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک اردو کا یا آدھا مصرعہ فارسی کا اور آدھا اردو کا ہوتا تھا اور یوں ادبی اعتبار سے یہ افتخار بھی صوفیائے کرام کو حاصل ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی ابتدائی نشوونما میں اپنے ریتختوں، دوہوں، ماہیوں اور گیتوں کے ذریعے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہ

کہنا امر واجب ہے کہ اردو ادب میں صوفیانہ شاعری کی ابتدا چھٹی صدی ہجری میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے ریتخوں سے ہوئی۔ متصوفانہ شاعری کی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے امیر خسرو نظر آتے ہیں۔ بیشتر تذکرہ نگار، محققین اور مورخین اردو شاعری کو آپ ہی سے شروع کرنے کے حق میں ہیں۔ آپ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے لیکن بد قسمتی سے آپ کا اردو کلام اسی طرح محفوظ نہ رہ سکا جس طرح فارسی کلام محفوظ ہے۔ حسب ذیل محققین نے آپ سے منسوب ریتخوں کے پیش نظر آپ ہی کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر قرار دیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

علامہ شبلی نعمانی (شعر العجم جلد دوم) (۶)

مولوی محمد حسین آزاد (آب حیات) (۷)

حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اردو) (۸)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیانے کرام کا کام) (۹)

رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو) (۱۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی (تاریخ ادب اردو، جلد اول) (۱۱)

اسپرنگر (جرنل آف ایشیائی ٹک سوسائٹی بنگال، ۲۵۸۱ء) (۱۲)

بزرگان چشت میں سے حضرت بابا فرید گنج شکر کے بارے میں مولوی عبدالحق مرحوم بابائے اردو اور حافظ محمود شیرانی نے یہ دعویٰ بڑے استدلال قوی کے ساتھ کیا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ادب اور لسانی رویے کے مطابق قد آور شاعر تھے۔ حضرت فرید شکر گنج کی شاعری نے لسانی عمل کو متحرک کیا جس سے اردو میں نئی لفظ سازی کے پودے نے جڑ پکڑ لی۔ اسے اردو کا اولین لسانی عمل بھی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ حضرت فرید شکر گنج کی شاعری میں ملتان، لاہور اور دہلی کے اسفار نے لسانی اثرات کو نمایاں جگہ دی۔ اگرچہ اس شاعری کی زبان اس بولی سے مختلف ہے جو ملتان میں دلی اور لاہور میں پہنچ کر ترقی کی منازل طے کر رہی تھی اور جو بابا فرید گنج شکر کے اپنے خاندان اور اہل و عیال کی زبان تھی۔ تاہم حضرت بابا فرید کی زبان میں ملتانی کے اثرات بھی موجود ہیں۔ رشید اختر ندوی کے مطابق ان کی زبان دہلی میں بولی جانے والی پراکرت یا ریختہ سے بظاہر کافی مشابہ ہے اس لیے کہ حضرت بابا فرید نے حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے شاگرد اور مرید کی حیثیت سے دہلی میں کافی دنوں تک قیام فرمایا تھا اور اس قیام سے ان کی زبان و لہجہ بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اس کے باوجود لفظی ترکیبیں جو ان کے ذہن کی تختی پر انیس برس کی عمر تک نقش ہوتی رہی تھیں، ان کی شاعری میں موجود ہیں اور ان سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ حضرت بابا فرید ملتان سے نکلتے وقت جو مادری زبان ہم راہ لائے تھے، دہلی نے اس پر اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملتان سے لاہور کے راستہ دہلی پہنچ کر ملتان اور لاہور کی ریختہ میں کیا کانٹ چھانٹ ہوئی اور ملتان و لاہور کی ریختہ نے اس لسانی سفر میں دہلی پہنچ کر کیا شکل اختیار کر لی تھی۔ (۱۳)

حضرت بابا فرید گنج شکر کے سبب زبان ریختہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوا اور اس میں نکھار بھی پیدا ہوا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی شاعری زبان قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی کہ حضرت امیر خسرو کی، اگرچہ امیر خسرو مکمل اور ہمہ وصف شاعر تھے اور ان کی شاعری میں شعر کی ہر رعنائی اور ہر شوخی تھی جب کہ حضرت بابا فرید ہمہ وقت درویش اور خدا رسیدہ بزرگ

تھے۔ تصوف اور زہدان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور شعر صرف ایک عارضی لگن تھی اور جیسے جیسے عمر کا کارواں آگے بڑھتا رہا، تصوف اور زہدان کے دل و دماغ پر زیادہ اثرات مرتب کرتے رہے۔ البتہ اس دور میں ان کی اولاد جو انہی کی زبان بولتی رہی جو ان کی ماں بولتی تھیں یا ماحول بولتا تھا۔ اور یہی زبان ہمراہ لے کر یہ اولاد دکن تشریف لے گئی اور حضرت بابا فریدؒ عوام الناس کے ذہن بدلنے کے لیے اچھوتوں میں مقیم رہ گئے۔ رشید اختر ندوی کے مطابق اور اس دوران انھوں نے عوام سے رابطہ کے لیے تین زبانیں استعمال فرمائیں:

- ۱۔ دہلی اور سرہند کی زبان جو ان کے شعر کی زبان تھی، یہ زبان وہ ان عوام سے بولتے جو ان کی شہرت سن کر تزکیہ قلوب کے لیے سرہند اور دہلی کے ماحول سے ان کے پاس آئے تھے۔
- ۲۔ قدیم ملتان کی زبان جو اچھوتوں کے علاقہ سے ملتی جلتی زبان تھی۔ وہ ان سب لوگوں سے بولتے جو ملتان اور بہاولپور حتیٰ کہ سندھ اور باقی اضلاع سے ان کے حضور باریاب ہوئے۔ (۱۴)

وہ خوش بو کا مرکز تھے اور یہ خوش بود دور دور تک پھیل گئی۔ ہزاروں عقیدت مند قلب و ذہن کی طہارت اور آبیاری کے لیے ان کے دربار میں حاضری دیتے۔ حضرت بابا فریدؒ ان کے ذہن بھی بدلتے اور اپنی گفت گو سے ان کی زبان پر بھی اثر انداز ہوتے اور یہ زبان پر اثر انگیزی تھی کہ اس علاقہ کی زبان ملتان کی زبان سے دور ہٹنے لگی۔ حضرت بابا فریدؒ گنج شکرؒ نے جہاں لاکھوں ذہنوں کو سنوارا، وہاں زبان کو بھی تبدیل کیا اور زبان ریختہ یا ہندی ان کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی کیوں کہ حضرت بابا فریدؒ گنج شکرؒ کی حیثیت محض ہندی کے ایک عظیم المرتبت ملتان شاعر ہی کی نہیں ہے وہ اس اولاد کے باپ اور ان مریدوں کے پیر و مرشد تھے، جن کے سبب ہندی زبان کے فروغ میں بہت مدد ملی تھی۔ حضرت بابا فریدؒ کی اولاد نے بھی زبان ریختہ کو بڑی وسعتیں بخشیں۔ حضرت بابا فریدؒ کے چھ بیٹے تھے اور تین بیٹیاں، پہلے بیٹے شیخ نصیر الدینؒ تو اچھوتوں یا پاک پتن ہی میں قیام فرما رہے لیکن ان کے بیٹے حضرت بابا زیدؒ اور ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدینؒ کے سبب گجرات اور مالوہ میں جہاں تصوف کی داغ بیل پڑی وہاں لاہوری، ملتان، ہندی، دلی، دکن کے سانچے میں ڈھلی تھی۔

حضرت بابا فریدؒ کے دوسرے بیٹے شیخ شہاب الدینؒ کی اولاد کافی ہوئی اور اس اولاد نے جہاں تصوف کو آگے بڑھایا وہاں زبان کو بھی خوب پھیلایا تھا۔ مثلاً شیخ حسام الدینؒ، شیخ عبدالحمیدؒ اور شیخ مسعودؒ نے تو دکن کا قیام کیا (۱۵)۔ جب کہ شیخ بدر الدینؒ سلمانؒ حضرت بابا فریدؒ کے تیسرے بیٹے تھے، ان کے پوتے شیخ معز الدینؒ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں گجرات پہنچے تھے اور موت تک وہیں رہے اور زبان کی نشوونما میں بھی خوب حصہ لیا اور تصوف بھی خوب پھیلایا۔ ان کے دوسرے بھائی شیخ علم الدینؒ، شیخ الاسلامؒ کی حیثیت سے دکن تشریف لے گئے اور دو سال تک وہیں رہے ان کی بیوی بچے اور اعضاء اور خدام بھی ان کے ساتھ دکن گئے تھے (۱۶)۔ شیخ معز الدینؒ کے صاحبزادے افضل الدینؒ نے باپ کے ساتھ دین اسلام اور زبان کی اشاعت و فروغ میں برابر کی دلچسپی لی تھی اور باپ کے بعد دکن میں یہ شمع روشن رکھی۔ شیخ علم الدینؒ کے صاحبزادے مظہر الدینؒ باپ کے بعد شیخ الاسلام بنے (۱۷)۔ حضرت بابا فریدؒ کے ایک بیٹے خواجہ نظام الدینؒ سلطان بلبن کی فوج میں ملازم ہوئے اور پھر محمد تغلق کے عہد میں ترقی پائی، وہ بھی دکن اور گجرات میں کئی سال تک رہے تھے (۱۸)۔ ان کے بیٹوں میں سے خواجہ ابراہیمؒ نے بھی دکن اور گجرات میں زبان ریختہ کی خدمت کی۔ شیخ یعقوبؒ نے جو

سب سے چھوٹے تھے، امر وہہ میں ملتان ہندی کی جوت جگائی تھی کیوں کہ وہ امر وہہ میں بس گئے تھے اور وہیں وفات پائی تھی۔ ان کے دو صاحب زادے تھے خواجہ معزالدینؒ اور خواجہ قاضیؒ، حضرت خواجہ معزالدینؒ دکن میں مقیم رہے اور وہیں وفات پائی۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بعد امیر خسروؒ کے ہاں صوفیانہ تصورات اور خصوصیات کے ساتھ ساتھ فن موسیقی کا وسیع خزانہ موجود ہے۔ امیر خسروؒ ہندوستانی عوام کی زبان زیادہ بہتر اور زیادہ بولتے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار کو موسیقی اور مختلف راگ راگنیوں کے استعمال سے مزید قوت کے ساتھ عوام میں مقبول کیا۔ ان سے پہلے بھی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانؒ اور شیخ بہاء الدین برنادیؒ نے فن موسیقی کو اپنایا تھا، لیکن امیر خسروؒ نے اس میں جدت اور ندرت پیدا کی۔ کئی ساز اور راگوں کی ایجاد کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندوستانی موسیقی اور ساز کے اشتراک سے نئے ساز اور راگ بھی ایجاد کیے۔ اسی طرح اردو زبان میں باضابطہ شعر و شاعری کا سہرا بھی ان ہی کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے ہندی میں غزلیں، نظمیں، دوہے، پہیلیاں اور کہکراںیاں کہیں، جس کے نمونے اب ہمارے سامنے موجود ہیں، گویا اس کے بعد ہندی، ہندوی یا ہندوستانی میں شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ چل پڑا۔ امیر خسروؒ نے خیال، شہد اور شلوک کی حلاوت کے لیے بھی موزوں الفاظ کے شعری پیکر مہیا کیے اور بعض مخصوص راگوں کو ملحوظ نظر رکھ کر بھی اشعار کہے۔ یہ اشعار جب سماع کی محفلوں میں موسیقی کے لہرے پر گائے جاتے تو اپنا جادو خوب جگاتے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

”سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محفل سماع میں امیر خسرو رات کو جو کچھ پڑھتے صبح دلی کے گلی کوچوں میں ہر ایک کی زبان پر جاری ہو جاتا۔“ (۱۹)

امیر خسروؒ ۱۲۵۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ترکوں کے لاجپین قبیلے سے تھا (۲۰)۔ امیر خسروؒ تیرہویں اور چودھویں صدی کے صوفیا کرام میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے ارضی عناصر کو شاعری میں سموایا اور اردو دوانی کے ابتدائی دور میں اس زبان کو جذباتی گرمی، داخلی توانائی اور نیا انداز اظہار عطا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں لسانی وادبی روایت کا پیشرو حضرت امیر خسروؒ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ امیر خسروؒ (۱۲۳۵ء-۱۳۲۵ء) نے گیارہ سلاطین کا زمانہ حکومت دیکھا، بنگلہ نگر کی سیر کی اور شاعر ہفت زبان کہلائے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

”ان کی مادری زبان ہندوی تھی، مذہبی زبان عربی، دربار اور ادبیات کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ وہ ان سب زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور بعض مقامی بولیوں سے بھی آشنا تھے اور ان سب میں شعر کہنے پر قادر تھے۔“ (۲۱)

امیر خسروؒ ریختہ کے روایت ساز تھے ان کا کلام اردو کے تشکیلی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ امیر خسروؒ کی پہیلیاں، دوہے، کہکراںیاں، دوہے، گیت، کہات اور ڈھکوسلے وغیرہ ان کی لسانی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ہندی و فارسی اور مقامی زبانوں کو باہم شیر و شکر کر کے ایک نئے لسانی کلچر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عائشہ سعید کی رائے میں:

”ان کی پہیلیوں اور دوہوں وغیرہ میں بھی لسانی تشکیل کا ایک اہم رخ ملتا ہے۔..... ان کے بہت سے اشعار میں پوری، بھون پوری اور دہلوی الفاظ کی آمیزش ملتی ہے۔ مجموعی طور پر امیر خسروؒ کے

کلام کو کھڑی بولی کا اولین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔“ (۲۲)

امیر خسروؒ نے ہندوی شاعری میں زبان کا وہ روپ پیش کیا جو عوام میں مقبول ہو چکا تھا۔ انھوں نے لسانی تجربات کیے اور ان تجربات سے زبان کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کیا؛ نئی نئی اختراعات پیدا کیں۔ دوہے، کہہ مکرئیاں، دو سٹخے، پہلیاں، گیت کہاوت، ڈھکوسلے اور ریختہ وغیرہ اصناف میں جناب امیر خسروؒ کی تخلیقات بے حد معیاری ہیں۔ ان کی کتاب خالق باری ایک الگ نوعیت کی تصنیف ہے۔

لسانی تجربات، اختراعات اور ادبی تخلیقات کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسروؒ کا لہجہ دھیمہ، مہین اور لطیف ہے اور مزاج میں ہندی اور موسیقی رچی ہوئی ہے۔ امیر خسروؒ کی درج ذیل ریختہ غزل ایک مستند لسانی حوالے کا درجہ رکھتی ہے:

زحال مسکین مسکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
شباں ہجراں دراز چوں زلف و روز و صلت چو عمر کوتاہ
یکایک ازل دو چشم جادو بصد فرستہم برتسکین
چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں ماہ بکشم آخر
بخت روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منگے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں (۲۳)

لسانی اعتبار سے اس غزل کے مطلع کا آدھا مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندوی میں ہے۔ یہ لسانیات کا ایسا تجربہ ہے جس میں ہمیں اردو شاعری کے اولین نقوش بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ریختہ میں ایک مصرعہ فارسی کا اور دوسرا ہندی کا تخلیق کرنا بھی امیر خسروؒ کی اختراع شمار ہوتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال حسب ذیل ہے:

شباں ہجراں دراز چوں زلف و روز و صلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹو اندھیری رتیاں (۲۴)

امیر خسروؒ سے ایک ہندی دیوان بھی منسوب ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر امیر خسروؒ کی غرۃ الکمال کے دیباچے سے الفاظ نقل کرتے ہیں:

”انہوں نے عربی، فارسی اور ہندوی ایک ایک دیوان مرتب کیا۔ خود ان کا ایک شعر ہے:

چومن طوطی ہندم از راست میری
زمن ہندوی پرس تاغز گویم
امیر خسروؒ نے ’غرۃ الکمال‘ میں اپنے ہندوستانی پن اور ہندوی گوئی پر کچھ اس انداز فخر کا اظہار بھی کیا ہے:

خُزک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب شکر مصری ندارم گز عرب گویم سخن (۲۵)

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

”ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ خواجہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بد قسمتی سے ان کا کلام دست برد

زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا ہے۔“ (۲۶)

ڈاکٹر نذیر احمد بھی امیر خسروؒ کے کلام کی شہادت میں لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ (امیر خسرو) ہندی کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور انھوں نے اس زبان میں کافی سرمایہ بھی چھوڑا ہوگا۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ خسرو کا ہندی کلام سارا برباد ہو گیا۔ دراصل اس کی بازیابی کی پوری کوشش نہیں ہوئی۔“ (۲۷)

لیکن بعد کی تحقیق نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ شمس القادری نے ڈاکٹر اشپرنگر کے حوالہ سے اپنی کتاب اردو قديم میں امیر خسرو کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے جس کو اشپرنگر اپنے ۱۸۵۶ء میں اپنے وطن جرمنی لے گئے تھے۔ شمس اللہ القادری اس بارے میں لکھتے ہیں:

”شاہان اودھ کے کتب خانوں میں جو موتی محل اور توپ خانہ میں تھے، حضرت امیر خسرو کے دوسو چیتاں موجود تھے اور ان کے علاوہ ایک مجموعہ میں ان کا متفرق کلام جمع تھا، جس میں فارسی آمیز غزلیں اور کہہ مکریاں وغیرہ تھیں۔ ان دونوں مجموعوں کو ڈاکٹر اشپرنگر نے دیکھا تھا اور ان کے متعلق ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔“ (۲۸)

یہی وہ نسخہ ہے، جو گوپی چند نارنگ کو ۱۹۸۲ء میں سفر یورپ کے دوران برلن میں ہاتھ لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

”غرض شاہان اودھ کے کتب خانوں میں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے جو قلمی نسخے محفوظ تھے اور ان میں جو دوسو پہیلیاں تھیں، ان میں سے ۱۵۰ کا نسخہ برلن کی صورت میں مل جانا شائقین خسرو کے لیے ایک نادر تحفہ ہے یا نہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس سے خسرو کے ہندوی کلام پر مزید غور و خوض اور تحقیق و تفتیش کا ایک نیا درپچہ ضرور ادا ہو جاتا ہے۔“ (۲۹)

اس اہم نسخہ سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کی دو مثالیں پیش ہیں:

زرگر پسرے چوماہ پارا کچھ گڑھیے سنواریے، پکارا
نقد من ربود و بھکت پھر نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا
ترجمہ: ایک سنار کا لڑکا دیکھا جو خوب صورتی میں چاند کا ٹکڑا تھا۔ میں نے گڑھنے اور سنوارنے کے لیے کہا۔ وہ میرے دل کی دولت لے گیا اور میرا دل توڑ ڈالا۔ اب گڑھنے و سنوارنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔

گجری تو کہ در حسن و لطافت چوہی ایک دیگ دیہی برسر تو چتر سہی
از ہر دولت شہد و شکر می ریزد ہر گاہ کہ می گوئی دیہی لیہو دیہی
اور گجری تو اپنی سندرتا میں چاند کی طرح ہے۔ دیہی کا برتن تیرے سر پر شاہی چھتری طرح لگتا ہے جب تو پکارتی ہے کہ لے لو دیہی تیرے ہونٹوں سے شہد و شکر نکلتے ہیں۔ (۳۰)

تحقیق دانوں نے اس امر کو عیاں کر دیا ہے کہ امیر خسرو نے مختلف پیرایوں میں ہندوی الفاظ کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ نمونہ ہائے کلام پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں جناب امیر خسرو کا طریقہ جداگانہ تھا۔ یعنی کبھی ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا اردو تو کبھی آدھا اردو تو کبھی آدھا فارسی میں۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دونوں مصرعے اردو میں بنائے،

جن میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کی گونج تھی (۳۱)۔ یعنی امیر خسروؒ کبھی فارسی کی لڑیوں میں چند ہندی لفظوں کو جگہ دیتے ہیں تو کبھی فارسی مصرعوں میں اردو مصرعہ ٹانگنا انھیں پسند ہے یا پھر کبھی کبھی فقط ہندی لفظوں سے ہی مکمل مکمل مصرعہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر خسروؒ نے ہندوی الفاظ کو کس کس انداز میں اپنے اشعار کا حصہ بنایا اور لسانی عمل کو کیسے کیسے تحریک دی۔ جناب امیر خسروؒ نے ہندوی کلام میں جو زبان استعمال کی، وہ زبان کتنی صاف ستھری یا پھر اپنے عہد کے متقدمین اور متاخرین سے کتنی مختلف تھی۔ یہ تو مسلم ہے کہ مسعود سعد سلمان کے بعد جناب امیر خسروؒ کو ہندی اور اردو کے اولین شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ لسانی تناظر میں اس لیے ہر محقق کی نگاہ ان پر ہی جا سکتی ہے، سلمان عبدالصمد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”اگر خسروؒ کے زمانہ کا نمونہ کلام ہمارے سامنے ہوتا تو شاید ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ انھوں نے اپنے معاصرین سے الگ ہٹ کر ایک نئی زبان پیش کی۔ ان کے لفظوں کا آمیزہ دوسروں سے مختلف تھا۔ یہاں تو یہ صورت ہے نہیں، اس لیے خسروؒ کی زبان کے تعلق سے ہم فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی یا اردو ان کے ہندوی کلام میں آنکھیں کھول رہی تھیں، نہ کہ خسروؒ کی پرانی زبان کو صاف ستھرے انداز میں صیقل کر کے پیش کر رہے تھے۔“ (۳۲)

اس کے ساتھ ساتھ زبان کے خدمت گار کی حیثیت سے جناب امیر خسروؒ ایسے اولین سخن گو ہیں جن کے کلام میں مقامی تہذیب کی گونا گوں تصاویر اپنے رنگوں کی نقاشی کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ اس بارے سلمان عبدالصمد نے لکھا ہے کہ:

”ان کی اردو یا ہندوی شاعری اس لحاظ سے ایک بے مثال مرتبہ رکھتی ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ہندی بل کہ فارسی کلام کا پوٹریٹ کھڑا کرنے میں بھی ہندوستانی آلات کا استعمال کیا ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں ہندوستانی کی گونج ہے۔ ہندوی کی طرف ان کے میلان میں شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر وہ فقط تطن طبع کے لیے ہندوی کی طرف مائل ہوتے تو ہندوستانی پر شکوہ انداز میں ان کے یہاں جلوہ گر نہیں ہوتی۔“ (۳۳)

نمونہ ہائے کلام سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امیر خسروؒ کو ہندوی زبان پر قدرت بیان حاصل تھی اور امیر خسروؒ کے ہندوی کلام میں معیاری ہندوی کی نفاست پسندی ان کا کلام میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا پتا دیتی ہے۔ شبلی نعمانی نے اس تبصرہ کرتے ہوئے امیر خسروؒ کے کلام کی نزاکتوں اور ادبی مویشگانہ فنیوں پر ان کی مہارت اور قدرت بیان کی شہادت دی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس بارے میں لکھتے ہیں:

”..... اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گونا گوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دوہی چار پیدا کیے ہوں گے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی نظیری، بے شبہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں، لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔“

سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں اگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن خسرو کی جہاں گیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تقصیم، مستزاد اور صنایع و بدائع کا تو شمار نہیں۔“ (۳۳)

علامہ شبلی نعمانی نے امیر خسرو کی رباعیات کا جو ذکر کیا ہے۔ حافظ شیرانی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”گذشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے (حضرت امیر خسروؒ) جو نمونہ کلام دیا ہے، میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔ از قسم شہر آشوب:

تیلی پرے کہ می فروشد تیلے از دست وزباں چرب او واویلے
خالے پلش دیدم و گفتم کہ تل است گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے (۳۵)

معروف محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی حضرت امیر خسروؒ کے اس کلام کو رباعی گردانتے ہیں اور اپنی تحریر میں رباعیات پیشہ وراں کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

”ان تین کے علاوہ دو مزید رباعیاں مقدمہ اول میں درج کی گئی ہیں۔ ”جواہر خسروی“ میں اسی طرح کے کلام کو ”مثنوی شہر آشوب“ کہا گیا ہے۔ مولانا محمد امین چڑیا کوئی لکھتے ہیں۔ ایسی مثنوی کا نام شہر آشوب ہے۔ اسی نام سے تاریخوں میں اس کا ذکر ہے سنسکرت اور ہندی بھاشا میں اسی قسم کی نظم میری نظر سے گزری ہے۔ ”وہتی واکہ ولاس“ گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے جس میں تمام پیشہ وروں کے نام اور ان کے کام نظم میں بیان کیے گئے ہیں۔ غالباً اسی طرز کو حضرت امیر خسروؒ نے فارسی زبان میں لاکر ایک جدت اور فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کو مثنوی کیوں کہتے ہیں۔ یہ تو رباعیاں ہیں جو مختلف بحور میں ہیں۔“ (۳۶)

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ”حقائق“ میں حضرت امیر خسروؒ کی تین رباعیاں نقل کیں ان پر مختصر تبصرہ کیا، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

”ایک اور رباعی میں زلف کی جگہ خط کا ذکر ہے اور آخری فقرہ ”مورے باپا“ ہے یہ بھی ذواللسانین ہے لیکن ہندی ہو کر اس میں ”مورے“ برج ہے جب کہ ”باپا“ کھڑی بولی ہے۔“ (۳۷)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کا چار مصرعوں والا کلام رباعیات کہلا سکتا ہے۔ یوں فی اعتبار سے اگر یہ رباعی ہو تو اس طرح حضرت خسروؒ کو دیگر رباعی گو شعرا پر زمانی سبقت حاصل ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں:

رستم بہ تماشا ئے کنار جوئے دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہای زلفت چہ بود فریاد بر آورد کہ در درموئے

اگرچہ امیر خسروؒ کو اردو کے اولین ریختہ کا موجد بھی قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر علم عروض کی بنا پر اس کلام کو ہندی یا اردو رباعی تسلیم کر لی جائے تو حضرت امیر خسروؒ کو پہلا رباعی گو شاعر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ قول انور سدید:

”امیر خسرو کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے ارضی عناصر کو شاعری میں سمو یا اور فروغ اردو کے ابتدائی دور میں اسے جذباتی سرگرمی، داخلی توانائی اور جدیدیت عطا کر دی۔ امیر خسرو اردو کی ایک اہم ادبی تحریک کے بانی تھے اور انہوں نے اردو کے پہلے ریڈیو کی ترویج میں اولین خدمات سرانجام دیں۔“ (۳۸)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جناب امیر خسرو کی پیوند کاری دوزبانوں کے امتزاج کا بھی باعث بنی اور دو تہذیبوں کے ادغام میں بھی اس نے بھرپور مدد دی اور ایک نئی زبان کی لسانی تشکیل کی راہ ہموار کر دی۔ کیوں کہ وہ لسانیات کے ماہر بھی تھے، ہندوستانی موسیقی کی جدید ترتیب کے بانی اور مورخ بھی۔ نظام الدین اولیاء کے فیض صحبت نے ان کے صوفیانہ مزاج کو جلا بخشی تھی۔ انھوں نے اپنے وسیع مشاہدے، اپنی ژرف نگاہی اور دیدہ وری سے زندگی اور زبان کے جلوہ صدر نگ کا نظارہ کیا تھا۔ امیر خسرو نے سیاسی، تہذیبی، روحانی اور گونا گوں ارضی تجربات سے لسانی استفادہ کیا جس سے ان کے اجتماعی لاشعور میں تحریک پیدا ہوا تھا اور انہیں حیات کا جوا دراک حاصل ہوا وہ انھوں نے اپنے قارئین تک زبان کی صورت میں پہنچایا تھا۔

حوالہ جات

- ۱۔ روپینہ ترین، ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، (ملتان: بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۸۱)
- ۲۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳ء)، ص ۸۲
- ۳۔ سعد اللہ کلیم، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، (لاہور: الوقا ریپلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۳
- ۴۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، (اکتوبر ۱۹۵۵ء)، ص ۱۱-۱۳
- ۵۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۱
- ۶۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد دوم، (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۰-۸۷
- ۷۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن)، ص ۲۱
- ۸۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، (لاہور: مکتبہ معین الادب، س۔ن)، ص ۱۷
- ۹۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۵-۱۷
- ۱۰۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، (لکھنؤ: نول کشور، سن ندارد)، طبع دوم، مترجم: مرزا محمد حسن عسکری، ص ۱۷
- ۱۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیکیشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۷-۳۴
- ۱۲۔ اسپرگر، جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی، (بنگال: ۱۸۵۲ء)، ص ۱۵-۵۱۹
- ۱۳۔ رشید اختر ندوی، ریختہ کی تشکیل میں بابا فرید کا کردار، مضمون: اخبار اردو، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، اپریل ۲۰۱۲ء)، ص ۳
- ۱۴، ۱۵۔ ایضاً، ص ۴
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۲
- ۱۷۔ ایضاً، ص ۱۹۷
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۲
- ۱۹۔ محمد اکرام شیخ، آب کوثر، (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۷ء)، ص ۷۸
- ۲۰۔ عدنان طارق، تاریخ میں سفر، (لاہور: الہلال بکس، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۳۵
- ۲۱۔ سلیم اختر، اردو زبان کیا ہے؟، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۸

- ۲۲۔ عائشہ سعید، اردو کلاسیکی سرمایہ، مشمولہ: دریا سافت، (اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۷ء)، شماره ۶، ص ۶۰۹
- ۲۳۔ وحید اختر، خواجہ میر درد: تصوف اور شاعری، (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند) ص ۲۹۶
- ۲۴۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۹
- ۲۵۔ مجیب رضوی، خسرو نامہ، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۳۹
- ۲۶۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۶۵
- ۲۷۔ نذیر احمد، امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات پر ایک نظر، مشمولہ: ہندوستانی زبان (بمبئی، ۱۹۷۲ء)، خسرو نمبر، ص ۷۹
- ۲۸۔ شمس اللہ قادری، اردو کے قدیم، (لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۲۹ء)، ص ۳۰
- ۲۹۔ گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اشپرنگر (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، طبع سوم، ص ۱۰۸
- ۳۰۔ یہ شعری مثالیں گوپی چند نارنگ کی کتاب امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) اور شیخ سلیم احمد کی کتاب امیر خسرو (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء) سے لی گئی ہیں۔
- ۳۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۹
- ۳۲۔ سلمان عبدالصمد، خسرو کا ہندوی کلام، نظریات و اشکالات۔ انٹرنیٹ شاعت
<http://www.urdu.starnews.today/archives/22785>
- ۳۳۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد دوم، (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۰۸
- ۳۵۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، حصہ اول، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۳۵
- ۳۶۔ گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۶-۱۱۷
- ۳۷۔ گیان چند جین، حقائق، (نئی دہلی: مکتبہ الجامعہ، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۵
- ۳۸۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۳۸

